کرتے ہوئے کہا ہے: "کچھ فقہاء کے قول کے مطابق راستے میں نماز ادا کرنے والوں کا عمل افضل ہے اس لیے کہ انہوں نے نماز اپنے وقت میں ادا کرنے اور حضورؐ کے حکم کی پیروی کرنے کی دونوں فضیلتیں حاصل کر لیں، جب کہ کچھ دیگر فقہاء کے نزدیک بنو قریظہ کے ہاں پہنچنے تک نماز کو مؤخر کرنے والوں کا عمل افضل ہے....." یعنی فرق غلط اور صحیح کا نہیں بلکہ افضل اور غیر افضل کا ہے۔

ہمارے خیال کے مطابق جب کہ حضورؐ نے کسی فریق کو سرزنش نہیں کی، تو فقہاء رحمہم اللہ کو چاہیے تھا کہ وہ اسی پہ اکتفا کرتے، اور ایسی چیز کے بارے میں بحث مباحثے سے پرہیز کرتے، جس کا فیصلہ خود حضورؐ نے فرما دیا تھا۔

۲- اس کی دوسری مثال وہ حدیث ہے جسے ابوداؤد اور حاکم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "غزوہ ذات السلاسل کے دوران جاڑے کی ایک رات میں مجھے احتلام ہو گیا، مجھے خدشہ ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو کہیں میری موت واقع نہ ہو جائے، اس لیے میں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کی نماز فجر میں امامت کی، انہوں نے حضورؐ سے اس واقعے کا ذکر کر دیا۔ حضورؐ نے پوچھا "اے عمرو! تو نے احتلام کی حالت میں امامت کی ؟ میں نے اپنے غسل نہ کر سکنے کی وجہ بھی حضورؐ کے سامنے بیان کر دی اور یہ آیت پڑھی: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء - ۲۹) "اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بلاشبہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔" اس پر حضورؐ مسکرا دیئے اور کچھ نہیں کہا۔ گویا متذکرہ عذر کے ساتھ تیمم کرنے اور تیمم کے ساتھ جماعت کرا دینے کے فعل کو سند مل گئی۔

تاویل اور اس کی قسمیں عہدِ نبویؐ اور اس کے بعد صحابہؓ میں واقع ہونے والے سارے اختلافات کا بیان یہاں مقصود نہیں۔ بسا اوقات کچھ صحابہؓ نے الفاظِ عبارت کے بالکل ظاہری معنی مراد لیے اور کچھ نے اس سلسلہ کلام یا محاورہ و روزمرہ یا شریعت کی مجموعی فضا کے لحاظ سے معانی استنباط کیے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ مختصر سا مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال صحابہؓ نے ان واقعات سے یہ بات ذہن نشین کر لی تھی کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے اور شریعت میں کسی نص سے حکم کے استنباط کرنے کے لیے اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے۔

اب یہ ماہر مجتہدین اور فقہاء کا کام ہے کہ شریعت کے کلیات و قواعد اور اس کے مقاصد تک پہنچانے والے احکام بیان کریں۔ یہ مقصد کبھی ظاہر لفظ کو جوں کا توں لینے سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی اس ظاہر لفظ کے پیچھے پوشیدہ معنی کے استنباط سے، جیسے "تاویل" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالنا فائدے سے خالی نہ ہوگا، لہٰذا ذیل میں تاویل کی اقسام اور اس کے قواعد و ضوابط کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ قریبی تاویل: جسے معمولی غور و فکر سے معلوم کیا جاسکتا ہو اور وہ عبارت اس کا احتمال بھی رکھتی ہو، جیسے یتیم کا مال بطور صدقہ دینے، یا کسی اور کو بلا عوض دینے، یا اُسے ضائع کرنے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دے کر اسے اس قرآنی آیت کی رُو سے حرام ٹھیرایا جائے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا...... (النساء ۴: ۱۰) "جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے"۔

دوسری مثال۔ کسی برتن میں پیشاب کر کے اُسے ٹھیرے ہوئے پانی میں ڈال دینے کو ایسے پانی میں براہ راست پیشاب کرنے کے مترادف قرار دے کر اس حدیث کا مصداق ٹھیرانا جس میں ایسا کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے، حضورؐ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے جس سے اُس نے بعد میں نہانا ہے"۔ اس لیے کہ دونوں فعل پانی کی گندگی کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ دُور کی تاویل: جسے معلوم کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے زیادہ غور و فکر درکار ہو اور لفظ اس کا احتمال بھی رکھتا ہو۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ نے حمل کی کم از کم مدت مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے چھ مہینے اخذ کی:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف: ۱۵) "اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے"۔ اور دوسری آیت میں ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔ (البقرہ: ۲۳۳) "جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک

دُودھ پیئے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دُودھ پلائیں۔ (دو سال مدت رضاعت اور کم از کم چھ مہینے مدتِ حمل)۔

یا جیسا کہ امام شافعیؒ نے اجماع کی حجیت پر اس قرآنی آیت سے استدلال فرمایا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۔ (النساء-۱۱۵) "جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پہ راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے، جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اُسے جہنّم میں جھونک دیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے"۔

اِسی طرح اُصولیوں نے قرآنی آیت فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۔ (الحشر-۲) "پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو" سے قیاس کی حجیت اور اس کے شرعی دلیل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس طرح کے نتائج اخذ کرنا اگرچہ بظاہر آسان نظر آرہا ہے۔ مگر ان تک رسائی اس وقت تک مشکل ہے جب تک انسان کی سوچ وسیع اور نظر گہری نہ ہو، پھر اس کے لیے غور و فکر اور تدبر کے ملکہ کی بھی ضرورت ہے جو عام لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

۲- دُور از کار تاویل | جس کا احتمال لفظ کے اندر موجود نہ ہو، اور تاویل کنندہ کے پاس کسی قسم کی کوئی دلیل بھی نہ ہو، جیسے کسی نے اس آیت: وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (النحل-۱۶) "اس نے زمین میں راستہ بتلانے والی علامتیں رکھ دیں، اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں"۔ کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ "نجم" رسول اللہ ہے اور "علامات" امام ہیں۔ یا جیسے کسی نے اس آیت: وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔ (یونس-۱۰۱) "اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟" سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ "آیات" سے مراد امام ہیں اور "نذر" سے انبیاء۔ اِسی طرح کچھ حضرات نے عَمَّ يَتَسَاۗءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (النبا-۱-۲) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ کچھ کر رہے ہیں۔ کیا اس بڑی چیز کے بارے میں......" "نبأِ عظیم" سے مراد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات لی ہے۔[۱]

تاویل کے قواعد و ضوابط اب تک جو بات ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تاویل کے لیے غور و فکر کے علاوہ کسی دلیل (یا احتمال) اور ضرورت کی موجودگی بھی ضروری ہے بصورتِ دیگر نصوص کے ظاہری معنی کو اخذ کر لینا محفوظ طریقہ ہے۔ تاویل کی طرف صرف اجتہادی امور کی صورت میں رجوع کیا جائے۔ رہے اعتقادی مسائل تو ان میں اجتہاد کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں، ان میں نصوص کے ظاہری معنی لینا اور حقیقت میں مراد لیے گئے معانی اور کیفیات کو خدا کے سپرد کر دینا خالی از خطر راستہ ہے اور سلف صالحین کا بھی یہی موقف رہا ہے۔

تاویل ناگزیر ہو جانے کی صورت میں نص کو سمجھنا، اس کا تجزیہ کرنا، اور لغوی لحاظ سے ساری وجوہ کا احاطہ کرنا ضروری ہے (جو مقاصدِ شریعت اور عام شرعی کلیات اور قواعد کے مطابق بھی ہوں)۔ اسی لیے کسی مسئلے میں نص کے ظاہری معنی کے مطابق حکم بیان کرنا یا دلالت کی مختلف وجوہ معلوم کرنے کے لیے نص کا تجزیہ کرنا فقہی اجتہاد اور شرعی اعتبار و قیاس کی ایک اہم قسم ہے، جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ (الحشر ۲)
"پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!"

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے تفسیر کے قواعد و ضوابط بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں:

۱- ایک قسم ایسی ہے جو عربوں کے ہاں ان کے کلام میں معروف ہے۔
۲- دوسری قسم وہ ہے جس کے نہ جاننے میں کسی کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے (یعنی جو ہر ایک کو معلوم ہونی چاہیے)
۳- تیسری قسم جسے صرف علماء جانتے ہیں۔
۴- چوتھی قسم جسے صرف اللہ جانتا ہے۔

اس بنا پر تاویل اور تفسیر کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ شارع نے کئی مقامات پر ان میں سے

---

[۱] اصول الکافی ۱/۲۱۴

ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ إِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهٖ (آل عمران - ۷) ”ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے“۔

مفسرین کی اکثریت نے یہاں ”تاویل“ سے تفسیر اور بیان کو مراد لیا ہے۔ امام طبریؒ بھی ان میں شامل ہیں، جنہوں نے حضرت ابن عباسؓ اور دیگر حضرات سے اس کے یہی معنی نقل کیے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کے لیے جو دعا فرمائی اس میں فرمایا: اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ (اے اللہ! اسے دین کی سمجھ اور قرآن کی تفسیر کا علم عطا فرما)۔ یہاں بھی تاویل کا لفظ تفسیر اور بیان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کچھ علماء نے تفسیر کو تاویل کے مقابلے میں زیادہ ”عام“ شمار کیا ہے۔ جیسا کہ ”المفردات“ کے مصنف علامہ راغب اصفہانی کا خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ تفسیر کا لفظ زیادہ تر الفاظ کے بیان اور شرح کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ تاویل زیادہ تر معانی اور جملوں کے بیان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تاویل کا اطلاق عام طور پر کتاب و سنت کی نصوص سے معانی کے استنباط پہ ہوتا ہے، جب کہ تفسیر کا لفظ کتاب و سنت میں سے کسی بھی نص سے معانی کے استنباط پہ بولا جاتا ہے۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں استعمال کے لحاظ سے ان دونوں اصطلاحات کے درمیان پائے جانے والے گہرے تعلق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”تاویل“ کے قواعد و ضوابط بھی وہی ہیں جو ماہرینِ فن نے تفسیر کے لیے مقرر کیے ہیں۔

اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں چند ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جیسے اسماء اور صفاتِ خداوندی کی صحیح پہچان کا علم، اور امورِ غیبیہ کی تفصیلات وغیرہ۔ اسی طرح کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کا صرف نبیؐ کو علم دیا گیا ہے

اور کوئی شخص ایسی چیزوں کی تفسیر یا تاویل بیان کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی حدود کا پابند رہے اور ان سے تجاوز نہ کرے۔

اِن دو اقسام کے علاوہ ایک تیسری قسم بھی ہے، اور یہ ایسے علوم ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو تعلیم دی، جو قرآن میں موجود ہیں۔ اور حضورؐ کو حکم دیا کہ لوگوں کو ایسے علوم سکھائیں۔ اور انہیں بیان کریں۔ ایسے علوم کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ اُمور جن میں بحث و تمحیص کی گنجایش نہ ہو، بلکہ صرف منقول چیزوں پر اکتفا کیا جائے۔ جیسے قرآن کے اسبابِ نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ۔

۲۔ ایسے اُمور جو استدلال اور غور و فکر کے ذریعے معلوم کیے جائیں۔ ان کے بارے میں بھی علمائے حق کے دو موقف ہیں:

ا۔ ان اُمور کی پہلی قسم وہ ہے جس کی تاویل کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں ان کا آپس میں اختلاف ہے جیسے اسماء اور صفاتِ خداوندی سے متعلق آیات۔ اس کے بارے میں سلف کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں تاویل ناجائز ہے اور درست مذہب بھی یہی ہے۔

ب۔ دوسری قسم (جس کے جائز ہونے پر ان کا آپس میں اتفاق ہے) یہ ہے کہ تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کیے جائیں۔ اس کا نام "فقہ" ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ علماء نے تاویل اور تفسیر کی کچھ شرائط بھی مقرر کی ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ تاویل، لغوی قواعد اور الفاظ کے استعمال میں عربوں کے عرفِ عام کی روشنی میں سمجھ میں آنے والے ظاہری معنی کو ختم نہ کر دے۔

۲۔ کسی صریح نصِ قرآنی کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ علماء اور آئمہ کے درمیان کسی متفق علیہ شرعی قاعدہ کے خلاف نہ ہو۔

۴۔ سببِ نزول کے لحاظ سے نص جس مقصد کے لیے وارد ہوئی ہو، اس کا لحاظ رکھا جائے۔

جہاں تک باطل یا قابلِ ترک تاویل کی اقسام کا تعلق ہے تو انہیں مندرجہ ذیل چند اقسام

میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تاویل اور تفسیر کسی ایسے شخص سے صادر ہوئی ہوں جو ان کا اہل نہ ہو، جس کے پاس لغوی نحوی اور تاویل کے لیے ضروری دیگر شرائط کا خاطر خواہ علم نہ ہو۔

۲۔ متشابہات کی کسی صحیح سند کے بغیر تاویل۔

۳۔ ایسی تاویلات جو کتاب وسنّت کے واضح معانی یا اجماعِ اُمت کے منافی باطل آرا کو درست ثابت کرتی ہوں۔

۴۔ تاویل کے ساتھ قطعیت سے (بغیر دلیل لائے) یہ کہنا کہ شارع کی یہی مراد ہے۔

۵۔ ایسی تاویل جس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو، جیسے باطنیہ وغیرہ (فرقوں) کی تاویلات۔

یہ تمام قابلِ ردّ تاویلات "تاویل مستبعد" (دُور از کار تاویل) کے زمرے میں آتی ہیں۔ جس کا ذکر ہم پہلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ (باقی)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

رسائل و مسائل

سفر میں قصرِ صلوٰۃ

جناب مولانا عبدالمالک صاحب - شعبۂ استفسارات - منصورہ، لاہور

سوال:- ہمارے کالج میں ایک مسئلہ وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ اس میں راہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں:

۱- ہم طالب علم دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہیں، ہمارے کورس کی مدت ۹ ماہ ہے لیکن ہم ہر ہفتے واپس گھر چلے جاتے ہیں۔ کیا ہم نماز قصر ادا کریں یا مکمل۔

۲- جس آدمی پہ نماز قصر واجب ہے۔ وہ آدمی اگر مکمل نماز ادا کرے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

جواب:-

۱- آپ لوگ مقامی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی کوشش کریں تاکہ سرے سے یہ مسئلہ نہ پیدا ہو کہ آپ نے پوری نماز پڑھنی ہے یا قصر کرنا ہے۔ اگر اتفاقاً نماز با جماعت نہ ملے تو ایسے طلبا جن کے گھر کالج سے اڑتالیس میل (۴۸) کے فاصلہ پہ ہیں اور ہر ہفتہ گھر جاتے ہیں تو وہ قصر کریں۔ اور جنہوں نے پندرہ دن بعد گھر جانا ہو وہ پوری نماز پڑھیں۔ کیونکہ وہ مقیم شمار ہوں گے اور ہر ہفتہ گھروں کو جانے والے کالج کے ہاسٹل میں مسافر شمار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ جیسے دیندار اور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ فرمائے۔

۲- جس آدمی پر قصر نماز واجب ہے وہ قصر پڑھے۔ مقصد تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ رہی عبادت تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ فرضوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ نوافل پڑھے جاسکتے ہیں جیسے زیادہ عبادت کا شوق ہو وہ تہجد، اشراق، اوابین، صلوٰۃ التسبیح پڑھ لیا کریں۔

تین سوال

سوالات: سوالات درج ذیل ہیں:-

۱- ایک شخص ظہر کی نماز میں جماعت کے ساتھ اس وقت شریک ہوتا ہے جبکہ ایک رکعت گذر چکی ہوتی ہے۔ اب جب وہ یہ رکعت آخر میں پڑھتا ہے تو فاتحہ کے بعد وہ شخص جو سورت پڑھے گا۔ وہ قرآن میں ترتیب کے لحاظ سے پہلے آنے والی سورت پڑھے گا یا بعد میں آنے والی سورت۔ مثلاً جب وہ جماعت میں شریک ہوا تو دوسری رکعت جاری تھی۔ اور امام نے سورہ علق پڑھی۔ اب سلام کے بعد جب وہ کھڑا ہوگا تو کیا سورۃ الناس پڑھے یا سورہ فلق سے پہلے آنے والی کوئی سورۃ پڑھے گا؟

۲- رسالہ ہفت روزہ "ختم نبوت" میں جناب مولانا نے فتویٰ دیا ہے کہ ٹیلی وژن دیکھنا حرام ہے حتیٰ کہ اگر ٹی۔وی پر حج کی کارروائی بھی نشر ہو رہی ہو تو اس کے دیکھنے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ کیونکہ ٹی۔وی کے منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بہت سے مثبت پہلو بھی ہیں۔

۳- مسجد میں کھڑے ہو کر یا مسجد کے سپیکر سے کسی گمشدہ چیز کا اعلان کرنا یا کسی کے جنازے کی اطلاع عوام تک پہنچانا شرعاً درست ہے؟ کیونکہ ہماری مسجد کے امام صاحب اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

جوابات:-

۱- مقتدی جب امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پڑھنا شروع کرے تو فاتحہ کے بعد کوئی بھی سورۃ پڑھ سکتا ہے، ترتیب کا قائم رکھنا ضروری نہیں ہے۔ دراصل ایسا شخص